مولانا محمد عبدالسمیع ندوی
(دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

مولوی عبدالعلیم آغا

غلام ہندوستان میں ولایتی پٹھان شمالی ہند میں شہر شہر قصبے قصبے میں نظر آتے تھے جو ہندوستان کو دارالحرب سمجھ کر سودی کاروبار کرتے تھے، لوگوں کو نقد رقم قرض دینا، سود لگا کر وصول کرنا، قرض پر کپڑا فروخت کرنا اور موعودہ وقت پر ڈنڈا لے کر اپنا مطالبہ وصول کرنا، ان کا یہ دھندہ شہروں میں بھی ہوتا تھا دیہاتوں میں بھی، پیسہ اگر نہیں وصول ہوتا تھا تو یہ لوگ گالی گلوچ کے ساتھ مار پیٹ کی بھی دھمکی دیتے تھے بروقت اگر کوئی نہیں ملتا تھا تو وہ پتا لگا کر وقت پر آتے تھے ان لوگوں کو لوگ بالعموم ''آغا'' کے نام سے جانتے پہچانتے تھے، ''آغاؤں'' کے اس دھندے میں ہندو مسلم کی کوئی تفریق نہیں تھی، سب سے ان کا معاملہ یکساں تھا، اس دور میں اگر کوئی کسی چیز کے لیے شدید تقاضا کرتا تو یہ محاورہ زبانوں پر رائج تھا کہ تم تو ''آغا'' بن کر بات کرتے ہو یا ''آغاؤں'' کی طرح تقاضے کرتے ہو وغیرہ۔

۱۹۳۵ء کی بات ہے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا تعلیمی سال شروع ہوا تھا حضرات اساتذہ رجسٹر حاضری لے کر درجے میں تشریف لاتے حاضری لیتے کچھ پڑھا کر چلے جاتے تھے۔ ہمارے درجے میں پہلا گھنٹا مفتی صاحب کا تھا، مفتی صاحب تشریف لائے حاضری لی آخری نام ''محمد عبدالعلیم آغا'' کا پکارا، وہ موجود نہیں تھے، طلبہ ''آغا'' کے لفظ پر سوالیہ نشان بن گئے؟ ان کے ذہنوں میں ''آغا'' کا مذکورہ پس منظر ابھر آیا، مفتی صاحب چلے گئے تو زبانیں کھلیں یہ ''آغا'' کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ یہ آغا پڑھنے کیسے آ گیا؟ اس کا کام تو ڈنڈا لے کر پیسے وصول کرنا ہے، اس دن درجے میں ان کی آمد کا انتظار ہی رہا، طرح طرح کے

سوالات ذہنوں میں کروٹیں لیتے رہے، دوسرے دن بھی اس نام پر ''لبیک'' کہنے والا درجے میں کوئی موجود نہ تھا۔ تیسرے دن جب گھنٹی بجی تو دیکھا گیا کہ پرانے لڑکوں کے ساتھ ہاتھوں میں کتابیں لیے ایک نئی شبیہ بھی درجے میں داخل ہو رہی ہے۔ بھرا بھرا جسم، ابھری ابھری آنکھیں، چھوٹی سی گول ڈاڑھی، سر پر ترکی ٹوپی، علی گڑھ کٹ پاجامہ، واسکٹ پہنے جیب میں گھڑی ڈالے واسکٹ میں اس کی چین پھنسائے، مفتی صاحب بھی پیچھے پیچھے ہی پہنچ رہے تھے اس لیے اس نئی شبیہ سے تعارف کا موقع نہ تھا سب لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے حاضری ہوئی تو ''محمد عبدالعلیم آغا'' کے نام پر مذکورہ شبیہ کی زبان سے دوسرے طلبہ کی دیکھا دیکھی ''لبیک'' نکلا، ان کی اس ''لبیک'' نے سارے درجے کو ان کی طرف متوجہ کر دیا۔ مفتی صاحب پڑھا کر تشریف لے گئے تو ایک طرف سے سوال ہوا، آپ ہی ''عبدالعلیم آغا'' ہیں، آغا کے پس منظر سے بے خبر ان کی زبان سے نکلا ''جی ہاں میں ہی عبدالعلیم آغا ہوں۔'' درجہ قہقہوں سے گونج گیا، آغا صاحب حیرت زدہ ایک ایک کو دیکھ رہے تھے کہ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ دوسری طرف سے سوال ہوا ''جناب کا وطن'' جواب ملا ''جے پور'' میں نے گزارش کی تب تو آپ کے نام کے آگے پیچھے جواہرات لگے ہونا چاہیے یہ ''آغا'' کیا چیز ہے اس سے تو لاٹھی ڈنڈے کا تصور ابھرتا ہے۔ آغا صاحب حیران تھے کہ آخر نام پر اتنا مناقشہ کیوں ہو رہا ہے کوئی علمی سوال کیا ہوتا یا کچھ اور پوچھا جاتا، لیکن نہ تو طلبہ اپنی الجھن بتا سکے اور نہ آغا صاحب اپنا تردد رفع کر سکے اس لیے کہ گھنٹے پہ گھنٹے بجتے رہے، اساتذۂ کرام آ آ کر پڑھاتے رہے تا آں کہ مدرسے کا وقت ختم ہو گیا اور سب اپنے اپنے ٹھکانوں کو روانہ ہو گئے۔

ظہر کی نماز میں آغا صاحب نے مجھے پکڑا اس لیے کہ میرا ہی سوال آخری سوال تھا، اپنا استعجاب ظاہر کیا یہ ہیرے جواہرات اور پھر لاٹھی ڈنڈے کی بات آپ نے کیا کہی مجھے بھی کچھ سمجھا دیجیے، ان کے اس سوال سے میں نے محسوس کیا کہ آغا صاحب آدمی سلجھے ہوئے ہیں ہم لوگ بیٹھ گئے پہلے تو کچھ رسمی باتیں ہوئیں جن سے معلوم ہوا کہ آغا صاحب شیخ صاحب کے ساتھ جے پور سے آئے ہیں اور انھیں کے پاس مقیم بھی ہیں پھر میں نے ان کو طلبہ کے سوال و جواب کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ''آغا'' کا پس منظر بھی سمجھا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ طلبہ

کل سے آپ کو" آغا، آغا" کہنے لگیں گے۔ اگر آپ نے کوئی اثر قبول کیا تو بات بڑھ جائے گی۔

دوسرے دن طلبہ نے ان کو چڑانے کی کوشش کی ،لیکن موصوف مسکراتے ہی رہے، جلدی یہ ذکر مذکورہ ختم ہو گیا اور کچھ عرصے کے بعد رجسٹر حاضری سے بھی "آغا" کا لفظ نکل گیا۔

یہ تھا میرے اور مولوی عبدالعلیم صاحب مرحوم کے درمیان ربط وتعلق کا آغاز جس کے بعد ان کے جوہر کھلنے لگے، رفاقت بڑھنے لگی، ایک نے دوسرے کو پہچاننا شروع کیا، "آپ" و "جناب" کا پر تکلف طرز خطاب جلدی "تم" جیسے بے تکلف خطاب میں تبدیل ہو گیا، یہی صورت درجے کے تمام ساتھیوں کے ساتھ پیش آئی سب سے ہمدردی ومحبت، خلوص وایثار، دکھ درد میں شرکت نے ان کو درجے میں ممتاز حیثیت دے دی۔

بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ سب سے جڑے رہتے تھے اور سب کو جوڑے رکھنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ ایک کتاب کے سلسلے میں طلبہ کا عام تاثر یہ تھا کہ اس مضمون کی تعلیم اپنے معیار کے مطابق نہیں ہو رہی، انھوں نے ڈپارٹمنٹ کو درخواست دی جس کی اطلاع متعلقہ ٹیچر کو ہو گئی۔ طلبہ کی درخواست کا جواب ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ سے نہیں ملا تھا، اس لیے طلبہ منتظر اور خاموش تھے، ٹیچر نے یہ سمجھا کہ طلبہ پڑھنا نہیں چاہتے انھوں نے پرنسپل صاحب کو رپورٹ دے دی جس کی اطلاع طلبہ کو ہو گئی، ان کی یہ غلط فہمی صاف کرنے کے لیے مولوی عبدالعلیم صاحب نے راقم الحروف سے کہا، میں ٹیچر صاحب سے بعض مصالح کے پیش نظر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مولوی عبدالعلیم صاحب کا موقف یہ تھا کہ اگر ٹیچر کی غلط فہمی صاف نہ کی گئی تو طلبہ کا مقدمہ کمزور پڑ جائے گا، مگر ایک مشکل یہ آ پڑی تھی کہ ٹیچر صاحب کی رپورٹ کا علم ہونے پر طلبہ کے مزاج میں اشتعال پیدا ہو گیا تھا اور اب واقعی وہ ان سے پڑھنا نہیں چاہتے تھے، لیکن مولوی عبدالعلیم صاحب کا دباؤ مجھ پر بڑھتا رہا بالآخر میں بات کرنے پر آمادہ ہو گیا، لیکن اب اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ طلبہ "نہ پڑھنے کا" اپنا فیصلہ تبدیل کریں یہ کام مولوی عبدالعلیم صاحب نے اپنے ذمے لیا، ہنس کر، مسکرا کر، اونچ نیچ سمجھا کر، انھوں نے کسی کو جوڑا، کسی کو توڑا، آخری گھنٹے تک وقفے وقفے سے وہ سب کو تیار کرتے رہے اور مجھ سے کہہ دیا کہ آپ اپنا کام کریں، طلبہ کو اشتعال کی حالت میں کنٹرول کرنا انھیں کے بس کی بات تھی دوسرا یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔

کبھی کبھی وہ سارا معاملہ اپنے سر لے لیتے تھے اور ساتھیوں کو بچا لے جاتے تھے ایک بار یہ ہوا کہ پہلا اور تیسرا گھنٹا خالی تھا دوسرا گھنٹا منطق و فلسفے کا تھا وہ خالی نہیں تھا طلبہ کی خواہش ہوئی کہ یہ دوسرا گھنٹا بھی خالی ہو جاتا تو ہم لوگ دوسرے ضروری کام کر لیتے، پتا لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ استاد گرامی موجود ہیں سیدھے سبھاؤ چھٹی ملنے کی توقع نہیں تھی انکار ہو جاتا۔ سوال ہوا کہ معاملہ کس طرح حل ہو، میں نے کہا کہ مولانا کو میں کہہ تو دوں گا، لیکن وہ اگر پہچان گئے کہ کون ہے تو میری شامت آ جائے گی ممکن ہے بات مہتمم صاحب تک پہنچے مولوی عبدالعلیم صاحب نے مجھ سے منصوبہ معلوم کیا، میرے بتائے پر انھوں نے کہا کہ فکر نہ کرو میں موجود رہوں گا اور معاملے کو سنبھال لوں گا، بات طے ہو گئی طلبہ اپنی اپنی کتابیں لے کر کمرے سے چلے گئے درجے میں میرے اور مولوی عبدالعلیم صاحب کے علاوہ دو طالب علم اور رہ گئے، جیسے ہی دوسرا گھنٹا بجا میں درجے سے نکل کر زینہ والی برجی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا، گھنٹا بجنے پر بالعموم اس جگہ طلبہ کا رش ہو جاتا تھا۔ ادھر دفتر سے مولانا رجسٹر لے کر نکلے برجی کے پاس جب پہنچے تو میں نے ان سے عرض کیا کہ مہتمم صاحب نے آپ کو ابھی بلایا ہے وہ کچھ پریشان ہو گئے اور مہتمم صاحب کے پاس جانے کے لیے زینہ چڑھنے لگے میں درجے میں آیا اور دوسرے دونوں طلبہ کو لے کر کنارہ والی برجی کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ مولانا مہتمم صاحب کے پاس پہنچے، مہتمم صاحب نے فرمایا کہ ''مولانا آج یکم اپریل ہے کسی لڑکے نے آپ کے ساتھ شرارت کی ہے میں نے آپ کو نہیں بلایا۔'' مولانا نیچے اترے تو اب ان کا گرجنا برسنا دیدنی تھا، ڈنڈا ہاتھ میں لیے پوری گیلری میں ٹہل ٹہل کر گرج برس رہے تھے کس نے مہتمم صاحب کے پاس مجھے بھیج دیا۔ ''وہ گدھا کون ہے؟ بلاؤ اس کو۔'' مولوی عبدالعلیم نے ان سے عرض کیا کہ ''کیا بات ہو گئی ہے؟'' مولانا نے بتایا، مولوی عبدالعلیم نے کہا کہ حضرت آپ درجے میں تشریف رکھیں، میں پتا لگاتا ہوں اور پھر گیلری میں آ کر مولوی عبدالعلیم صاحب بھی چند منٹ گرجتے برستے رہے، ۔ درجے میں آئے تو مولانا نے پوچھا، لڑکے کہاں ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ انعامی مقابلوں کے جلسے ہونے والے ہیں پہلا گھنٹا خالی تھا کوئی آیا نہیں اب لڑکے آ رہے ہوں گے مولانا بولے، ''اب میں کیا پڑھاؤں گا تم سب کی

حاضری بھر دو میں بھی جاؤں۔'' مولوی عبدالعلیم صاحب نے سب کی حاضری بنائی، مولانا رجسٹر لے کر رخصت ہو گئے تو بر.جی کے پاس مولوی عبدالعلیم کی مسکراتی ہوئی شکل نظر آئی میں نے کہا، یار بڑی دیر لگ گئی۔ بولے، اماں بڑا ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا، مشکل سے سنبھال پایا ہوں۔ میں نے پوچھا، یہ بتاؤ کہ مولانا مجھے پہچانے کہ نہ پہچانے۔ کہنے لگے، بالکل نہیں پہچانے، ورنہ سب سے پہلے تمھاری طلبی ہو جاتی۔

مولوی عبدالعلیم صاحب طلبہ کے مسائل سے دلچسپی تو ضرور لیتے تھے، لیکن ذرا اپنا دامن بچا کر اس لیے کہ ان کی رہائش شیخ صاحب کے پاس تھی وہی اس وقت دارالعلوم کے مہتمم، سیاہ و سپید کے مالک تھے، ۱۹۳۲ء میں مدح صحابہ کی تحریک کی وجہ سے لکھنؤ کے مغربی حصے میں شیعہ سنی فساد ہو گیا، جب تک مغربی علاقے میں فساد رہا تب تک کچھ آگے بات نہیں بڑھی، ایک دن شام کے وقت قیصر باغ منڈی کے سامنے کسی شیعہ نے ایک سنی کے چھرا مار دیا۔ منٹوں میں اس کی اطلاع ندوہ پہنچ گئی رات کو عشاء کے بعد مولانا شبلی فقیہ کے نواسے ذوالفقار علی اور مولوی جلیل احسن صاحب کے درمیان سازش ہوئی۔ مولوی جلیل احسن صاحب چوں کہ پیر سے معذور تھے اس لیے انھوں نے بندوق ذوالفقار علی کے کاندھے پر رکھی، ششماہی امتحان کا زمانہ تھا گرمی کے دن کچھ طلبہ سو رہے تھے کچھ پڑھ رہے تھے ایک بجے رات کو شور ہوا'' پکڑو پکڑو'' میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ذوالفقار علی مسجد کی طرف'' پکڑو پکڑو'' کی ہانک لگاتے ہوئے بھاگ رہے ہیں میں بھی ان کے پیچھے ہو لیا اور پھر قافلہ بنتا گیا، آم کے باغ میں پہنچ کر میں نے ذوالفقار علی سے پوچھا، کیا قصہ ہے تو انھوں نے بتایا کہ میں سو رہا تھا چارپائی کو دھکا لگا تو آنکھ کھلی ایک آدمی چھرا لیے کھڑا حملہ کرنا ہی چاہتا تھا کہ میں اچھل کر کھڑا ہو گیا اور شور کر دیا وہ میرے اچھلنے پر باغ کی طرف بھاگا، باغ میں اچھی طرح تلاش کیا گیا، باغ کے محافظ سے دریافت کیا گیا اس نے بتایا کہ ایک آدمی ادھر سے بھاگ گیا ہے ذوالفقار علی کے بیان کی توثیق ہوئی، لیکن تلاش میں ناکامی، سب واپس آئے۔ مولانا شبلی فقیہ مرحوم، مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی مرحوم نے دریافت کیا تو یہی قصہ ان کو بھی بتایا گیا، قرار پایا کہ کل سے طلبہ اپنی ڈیوٹیاں لگائیں اور باری باری پہرہ دیں۔ صبح ذوالفقار علی میرے پاس آئے اور پوچھا کہ کیا جان دینا

ہے؟ مولوی جلیل احسن صاحب نے بھی تائید کی کہ جب تک یہ فسادات چل رہے ہیں دارالعلوم میں تعطیل ہو جانا چاہیے۔ گھنٹی بجی تو طلبہ دارالعلوم پہنچے، ذوالفقار علی نے کنویسنگ شروع کی درخواست کے مسودے کی خدمت مولوی عبدالعلیم صاحب کے سپرد ہوئی طلبہ کے دستخط ہوئے شیخ صاحب کو پیش کرنے کا سوال اٹھایا تو مولوی عبدالعلیم صاحب کترا گئے ان کو کترانا بھی چاہیے تھا اب یہ یاد نہیں کہ کس نے یہ درخواست پیش کی۔

مولوی عبدالعلیم صاحب میں دوسری خوبی یہ تھی کہ کبھی اگر ناگواری کی کوئی بات ہوگئی تو وہ اس کو بالکل پی جاتے تھے، اس کا کوئی تذکرہ بھی نہیں کرتے تھے، ان کی یہ خوبی ان کے تعمیری جذبے کی غماز تھی، اس خوبی کے حامل کو عارضی طریقے سے جو کچھ بھی پریشانی ہو، آخر میں جیت اسی کی ہوتی ہے۔ مجھے تجربہ تو نہیں ہوا، اس لیے کہ دارالعلوم سے نکلنے کے بعد وہ کہیں تھے میں کہیں تھا، لیکن میرا خیال ہے کہ مرحوم کی اس خوبی نے ان کے سخت حالات میں ضرور ان کی دستگیری کی ہوگی۔

مرحوم کی تیسری خوبی ان کی وضع داری اور ان کا خلوص تھا جس سے جس طرح ملے پھر اس سے زندگی بھر اسی طرح ملتے رہے، دوسروں کے بارے میں تو میں نہیں جانتا، لیکن اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے طالب علمانہ زندگی کے بعد اپنے اس ساتھی کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ حالات کی ناسازگاری، تنگئی بالخصوص باڈر کی مصنوعی سفید پٹی نے ایک کو دوسرے سے جدا ضرور رکھا، لیکن جب جب ملے ٹوٹ کے ملے۔

غالباً ۱۹۵۸ء کی بات ہے میں لاہور میں استاد گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی رفاقت میں مقیم تھا کسی باوثوق ذریعے سے مجھے حیدرآباد سندھ میں مرحوم کی موجودگی کی اطلاع ملی، حیدرآباد جب پہنچا تو ایک دن ان کی تلاش میں نکلا لطیف آباد جو آج ایک شہر کی حیثیت رکھتا ہے ان دنوں بے آب و گیاہ ریگزار تھا، گھر پایا تو ہانک لگائی جواب ملا ''کون''؟ میں نے نام بتایا تو بولے ''اندر آجاؤ'' اندر گھسا تو ان پر نظر پڑنے کے بجائے کبوتروں کے لمبے لمبے پنجرے تلے اوپر سامنے نظر پڑے نگاہیں ان پنجروں میں الجھ گئیں میں نے آواز دی کہاں ہو سامنے آؤ کانوں میں آواز پڑی ''یہاں ہوں'' نظر جو اٹھائی تو دیکھا کہ

کھڑکی کی سلاخیں پکڑے بیٹھے ہیں میں ان پنجروں کا طواف کرتا رہا اور باتیں بھی کرتا رہا کھڑکی سے اتر کر تشریف لائے گلے ملے کبوتروں کے بارے میں تفصیلات بتاتے رہے کچھ دیر ٹھہر کر اور یہ وعدہ لے کر شام کو فلاں جگہ ملو گے، چلا آیا۔

۱۹۶۸ء میں پھر پاکستان پہنچا گھر تو معلوم ہو ہی چکا تھا اس مرتبہ یہ آسانی بھی ہوئی کہ ہمارے پھوپھا منشی امتیاز علی صاحب بھی ہیرآباد سے لطیف آباد منتقل ہو گئے تھے اور جھونپڑوں کی ایک مسجد میں دونوں کی ملاقاتیں ہو چکی تھی پھوپھا مرحوم کو معلوم ہو گیا تھا کہ ہم دونوں ایک ساتھ کے پڑھے ہوئے ہیں۔ میں لطیف آباد پہنچا تو پھوپھا نے مجھ سے مرحوم کا تذکرہ کیا اور مغرب کی نماز میں ملاقات ہوئی دولت خانے پر حاضری دی، صبح وشام کے اکثر اوقات مرحوم کی معیت میں ہی گزرتے تھے اور اگلی پچھلی باتوں کے دفتر کھل جاتے تھے۔

۱۹۷۷ء میں پھر میں حیدرآباد پہنچا، لیکن اب لطیف آباد کا ریگزار، شہر بن چکا تھا۔ پہلے انھیں کے دولت کدے پر حاضری دی، اس مرتبہ میں دو ماہ پاکستان میں رہا اور ان دو ماہ کا بڑا حصہ حیدرآباد ہی میں گزرا صبح وشام کی حاضری تو معمولاً تھی۔ پھوپھی صاحبہ مرحومہ کے کچھ قضیے جائیدادی تھے جن میں مرحوم نے میری رفاقت کی، مشورے دیے، اثرات و تعلقات استعمال کیے، بھاگ دوڑ کی بالآخر وہ مسئلہ حل ہو گیا۔

پاکستان سے ہندوستان جب میری واپسی ہونے لگی تو میں نے ان سے لکھنؤ آنے کا وعدہ لیا میری واپسی کے کئی سال بعد جے پور سے ان کا خط ملا کہ" میں جے پور پہنچ گیا ہوں، اب لکھنؤ آ رہا ہوں۔'' ایک دن شب میں غالباً مغرب کے بعد مع ایک جے پوری رفیق کے میرے ہاں لکھنؤ پہنچ گئے۔ جس جوان نے دارالعلوم اپنی جوانی میں چھوڑا تھا سرد وگرم زمانہ جھیل کر اپنے بڑھاپے میں اسی سرزمین پر اپنے ہی جیسے ایک بوڑھے سے ملنے کے لیے قدم رکھ رہا تھا دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی دیدہ ودل فرش راہ ہو گئے، خوشی ومسرت کے آنسو آنکھوں میں تیر گئے، لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ ملاقات آخری ملاقات ہوگی یہ خوشی سوگ میں تبدیل ہوگئی، صاحب زادے ڈاکٹر محمد عبدالمقیت صاحب کا مکتوب ملا جس سے سانحۂ ارتحال کی اطلاع ملی دن تو بہت بیت گئے، لیکن غم کا مارا دل آج بھی بوجھل ہے، مولوی عبدالعلیم

صاحب کا جب بھی خیال آ جاتا ہے، آنکھوں میں غم کے آنسو تیرنے لگتے ہیں ایک ''ہوک'' سی اٹھتی ہے کہ ''میں تنہا رہ گیا'' مولوی عبد العلیم چلے گئے میں نے ان کو کہاں نہیں تلاش کیا، ریگزاروں میں تلاش کیا، جھونپڑوں میں تلاش کیا، محلوں میں تلاش کیا، ہر جگہ ملتے رہے، لیکن اب کہاں ملیں گے؟ اب کہاں تلاش کروں؟

احباب اس وقت بھی پوچھتے تھے اور آج بھی پوچھتے ہیں کہ مولوی عبد العلیم صاحب سے آپ کے ربط و تعلق کی یہ ہمہ جہتی و ہمہ گیری کیوں اور کیسے ہے؟

جواب میں سیّدنا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت پیش کر کے اپنی یہ درازنفسی ختم کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مولوی عبد العلیم صاحب کی مغفرت فرما کر ان کے مراتب بلند فرمائے۔

> جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لوگ کانیں ہیں جیسے سونے چاندی کی کانیں ہوتی ہیں۔ جو جاہلیت میں شریف تھے وہ اسلام میں بھی شریف ہیں بشرطے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں۔ اور روحیں مختلف النوع فوجیں ہیں اگر عالم بالا میں ایک نے دوسرے سے ملاقات کی ہے تو یہاں بھی ان سے مانوس ہوں گی اور جو وہاں انجانی تھیں تو یہاں بھی وہ الگ الگ رہیں گی۔
>
> (مسلم شریف)

☆☆☆